کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک خاص رسم سی پیدا ہوگئی ہے۔ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذہب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہل مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کرسکیں اور یوں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئیداد کو پڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم ازکم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن وسلامتی کا پیغامبر اور نوع انسانی کے لئے آیۂ رحمت ہے۔ اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسن سلوک اور وسعت نظر کی تعلیم عام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام، دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص افضلیت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآن کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں قانون فطرت کے مطابق ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ ان اجتماعات میں اسلام کی وسعت نظر، کشادگی ظرف، رواداری، حسن سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی اس خصوصیت، یعنی اس کی افضلیت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں لایا جاتا۔ کیونکہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس طرح دیگر اہل مذاہب کی دل شکنی ہوگی اور وہ اسلام کے نمائندہ کو ''متعصب اور تنگ نظر'' خیال کریں گے۔ لہذا رواداری اور کشادہ نگہی کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہوکر اسلام کے نمائندوں کو، اسلام کی صحیح ترجمانی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ ایسے سمٹے

سمٹائے، جھجکتے لجاتے ہوئے آتے ہیں!

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

اس نقطۂ خیال سے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منجر نہیں ہوتیں۔ بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے۔ ان اجتماعات کے انعقاد سے یہ مقصد ہو یا نہ ہو، لیکن ان کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پسِ پشت ڈال کر، اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم اور یہ احتمال قیاسی نہیں۔

اوائل جون 1941ء میں شولاپور کے مقام پر اسی قسم کی ایک ''تمام مذاہب کی کانفرنس'' منعقد ہوئی۔ جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن پنڈت سندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات وسعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اصل مذہب ''خدا پرستی اور نیک عملی'' کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے۔ فرق صرف شرع ومنہاج (یعنی فروعات) میں ہے۔ اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ شروع سے اخیر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح وبسط سے اقتباسات پیش کر دیئے جن سے حرفاً حرفاً ان کے دعوے کی تائید ہوتی تھی (آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا اور پنڈت جی نے اپنے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مجھے نہ تو ان امیال وعواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں۔ مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر

بھی نجماً نجماً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تا کہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہہ کر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہوسکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا موید ہے۔ اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ''تمام مذاہب یکساں ہیں' عالمگیر سچائیاں سب میں ایک جیسی ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی نجات و سعادت کی ضامن ہے۔ ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہوسکتی۔'' وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آئند ہیں کہ سطح بیں نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہو جاتی ہیں اور جب اس سطحی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسر قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحرِ حلال بن جانے میں کون سی شئے مانع ہوسکتی ہے؟

رواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعتِ نگاہ کی اس سراب آسا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہ اکبر کے دین الٰہی میں ملتی ہے۔ جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں اسی طرح وہ مساعیِ جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کے لئے مجاہدانہ انداز سے معرضِ وجود میں آئیں۔

برہمو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی اس لئے وہ ہمارے دائرہ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا۔ اس نظریہ کی اشاعت کی موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی۔ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالم دین اور مفسر کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا۔ لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا' سر پر اٹھایا اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی تعریف و توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے

ترجمہ میں ایک خصوصیت ضرور ہے جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا۔ لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب کی اشاعت کے زمانہ میں وفورِ شوق اور جوشِ عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی۔ برنگِ خود بینی نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس اژدہامِ مدح وستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہل نظر طبقہ کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی۔ چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری 1933ء) میں میرا وہ مضمون شائع ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کو اربابِ نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے بعد مختلف گوشوں سے اس نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ اس واقعہ کو آٹھ نو برس ہو چکے ہیں چونکہ وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہوئے تھے لوگوں کی نگاہوں سے وقتی طور پر گذرے اس لئے ان کی یاد محو ہوتی گئی (متفرق مضامین کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے) اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے اس لئے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھار مجلہ طلوع اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا۔ لیکن بایں ہمہ' یہ وقتی کوششیں ایک مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہوسکتیں تاوقتیکہ انہیں بہ تسلسل جاری نہ رکھا جائے' بالخصوص جبکہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذاہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں۔ میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کرلیں کہ اسلام میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظام زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے آرزوئیں اور کوششیں سب ختم ہوجاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد' جسے اس قدر اہمیت حاصل ہے' بھی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العین حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا مطمحِ نگاہ (عقیدہ) بلند اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہوگا' اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریۂ حیات (عقیدہ) کی ایک ذراسی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی

ہے تو دونوں لائنوں میں انچ بھر کا غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس کانٹا بدلنے میں اگر ایک نمبر کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف اپنی منزل ہی سے کوسوں دور ہو جائے گی بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہو گا۔ میرے نزدیک جناب آزاد کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آج کل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش پر آ رہے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب' کو سب سے اعلیٰ وارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے۔ اس طرح سے وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث ومناظرات کے اکھاڑے قائم ہوا کرتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اولیت وافضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا تو یہ مسلک ہے اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر پہنچ جانے کی تلقین کی جا رہی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ ناروا بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی اور میں اس سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہل مذاہب کی وسعتِ نگاہ اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں' اس کی اصلیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ (مثلاً) زید کا ایک بچہ ہے بڑا غبی اور نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی اور ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر کہتا پھرتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی یہ نہیں کہتا کہ میرے بچہ کو کوئی خاص افضلیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تو عمر کی خودستائی ہے کہ اپنے بچہ کے برابر کسی اور کو سمجھتا ہی نہیں!۔

فرمایئے کہ یہ اصول زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دامنی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غماز؟ دور حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کو دقت پیش آ رہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم وعقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ ان کے اصول وضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور گوناگوں مقتضیات کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں چنانچہ انہیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے ادھر ادھر سے اصول وقوانین مستعار لینے

پڑتے ہیں۔ اسلئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعاً قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان مذہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جارہی ہے کہ انہیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہورہے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے ارباب حل وعقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہوجائے اس کے مقابلہ میں وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے۔ انہیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیش نظر ان کے مذہب کے پیروؤں کا سمجھدار طبقہ اسلام کی طرف مائل نہ ہوجائے۔ ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اپنے مذہب گزیدہ نوجوانوں سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہب عالم سے اعلیٰ وافضل ہے' کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے۔ اس لئے انہوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچہ کے متعلق اختیار کی تھی۔ انہوں نے یہ کوشش شروع کردی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جاسکتا جہاں اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے اور اس طرح ان کے اپنے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کردیا جائے کہ مذاہب سب ایک جیسے ہیں اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار نہ ہوجایئے کہ اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ مذاہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے سب یکساں ہیں۔ باقی رہا نظام زندگی سو وہ مذہب سے الگ شے ہے' اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے قومیت ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک رہنے میں راز حیات ہے۔ ان زیرک حضرات نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو ''وحدت ادیان'' کے نقاب میں چھپا لیا اور قوم کی اجتماعیت کے لئے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کرلیا۔

یہ ہیں وہ مقتضیات وعواطف جن کے ماتحت ''یکسانیتِ مذاہب'' کی یہ تحریک وجود کوش ہوئی ہے۔ آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے۔ لیکن ذرا اس کی کیفیت قلب کا

بھی تو احساس کیجیے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انہیں اس امر کے اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دین حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا اور یوں اس کی افضلیت واکملیت کا اقرار لیا جا سکتا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن میں قرآن کے اس دعوے کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (61:9)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ حیات اور نظامِ حقیقی دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آ جائے، خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو کہیئے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ "تمام مذاہب یکساں ہیں" تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی علی الحقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرو گے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں، تو اسی قسم کا دعویٰ دوسرے اہل مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و توازن کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سو اول تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریات زندگی سے تنگ آ چکی ہے اور انہیں تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریۂ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکے۔ جن اقوام نے قومیت کو امن و سکون کا ضامن بتایا تھا، وہ اب محض

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً نباہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمۂ حیات کے

گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا کون ہے؟ عمؔر کے لئے تو یہ چیلنج نوید مسرت ہے کہ اس کے اور زیدؔ کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے۔ اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے۔ ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریات زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے پاک ہے۔ لیکن اس وقت میرا تخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں۔ اس وقت میں صرف انہیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس تخصیصِ تخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریقِ استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا میرا تخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل، حال اور مستقبل کی سرفرازی و سربلندی، ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت صرف اس نہجِ زندگی (دین) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآن کریم اور اس کے عملی پیکر محمد رسول اللہ ﷺ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے آپ کو (دوسروں کے پیمانوں کے مطابق) نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں ''اس تنگ نظری'' پر قربان کر دینی چاہئیں۔ اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایۂ رحمت میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ اور اگر آپ اسے (معاذ اللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے ایسا آسمان تلاش کر لیجئے جہاں چھوٹے کو چھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے۔ جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے۔ جہاں سچے سے اس لئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جہاں حقائق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہو جانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے اسلام میں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (61:9) جب یہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں تو اس حقیقت کے

اعلان سے اس لئے ہچکچاہٹ پیدا ہونا کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے' اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عملی شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ؁ (2:159)

جو لوگ ان باتوں کو چھپا لیتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں' باوجودیکہ ہم نے لوگوں کے لئے انہیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کی حصے میں آئی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

جناب آزاد کی محولہ صدر تفسیر تقریباً پونے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے' جس کے اخیر میں انہوں نے ان طوالانی مباحث کو چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جس سے پنڈت سندر لال جی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا دین' خدا کی عام بخشش ہے اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع ومنہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام واعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع ومنہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہوسکتا۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع ومنہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر ورسوم کو انسانی نجات و

سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب اپنی مشترک اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی ازسرنو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ الدین اور الاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جلد نمبر 1 ص:162۔163)

دوسرے مقام پر شرع ومنہاج کے اختلاف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال ورسوم نہ تو دین کی اصل حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق وباطل کا اختلاف ہے یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ لیکن روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ (ص:127)۔

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے۔ (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق وسباق کو ملا کر ملاحظہ کر لیں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے نجات وسعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور ''نیک عملی'' ہی کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدیہؐ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے اور رسالت نبی اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعت قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام ''نیک عملی'' ہے) یعنی ساری بحث کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ایمان بالرسالت یعنی قرآنی شریعت کی اتباع بھی ضروری

ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کفار و مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان رکھنے کے علاوہ نبی اکرم سے پیشتر کسی نہ کسی رسول اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آ جائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہؐ اور اتباع قرآن پر بھی ایمان لائیں۔ یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر قرآن کریم اہل کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہؐ اور اتباع قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات و سعادت کی کوئی راہ اور نہیں تو بات صاف ہو جائے گی۔ اس لئے کہ جب اہلِ کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہل کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام و ملل میں، حضراتِ انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے پیغامات آتے رہے۔ ان پیغامات کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کی عبودیت۔ اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل میں، مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے اختلاف ہوتا رہا۔ یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی شکل میں قائم رہتے۔ اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف و الحاق ہو جاتا۔ کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے۔ لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ یعنی انسانیت خود اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظام خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یعنی ہر رسول کے وقت کچھ تو گذشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (سچائیوں) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ

ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا اور ترمیم و تنسیخ بھی۔ لیکن یہ ترمیم و تنسیخ ہمیشہ ارتقاء وعروج کی طرف لے جاتی تھی۔ تنزل و ہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی۔ ذیل کی آیت مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط (2:106)

(ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس جیسا حکم آ جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن میں کتبِ سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ط (11:110) (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے) يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ لا وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ج (5:13) (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2:79) (افسوس ہے ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے)۔

اس قسم کے متعدد مقامات میں تحریف، الحاق، فراموشی، دانستہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں اور پھر اس حقیقتِ باہرہ پر خود ایک دنیا شاہد ہے۔ آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو بدلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اس امر کے لئے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا۔ تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشد و بلوغ کو پہنچ گئی۔ اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضراتِ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا، ان کی اصلی شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر

آئے تھے ایسے احکامات بدل دیئے جائیں جو قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات کے لئے مکتفی ہوں۔اس طرح ان تمام حقائق واصولات کو یکجا اکٹھا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اس مجموعۂ حقائق' ضابطۂ خداوندی کی اس (Latest) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآنِ کریم ہے۔اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہوگئیں۔ضابطۂ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آ گئیں۔اب نجات وسعادت کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے۔اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے ساقط العمل ہے۔اب دین ہے تو یہی۔اسلام ہے تو اسی کا نام۔ایمان ہے تو اس پر۔اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام نہ شریعت ہے نہ منہاج۔یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے۔اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا۔اسی نے ان تمام کو سمٹا کر اس ایک میں جمع کر دیا اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطۂ قوانین قرار دیا۔ اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے۔نہ نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضرات انبیاء کرامؑ میں کوئی فرق ہے نہ پیغاماتِ خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف۔اس کے ساتھ ہی یہ بھی اسی خدا نے فرما دیا کہ اب اتباع واطاعت صرف اس مجموعۂ قوانین کی ہوگی جس کا نام قرآن کریم ہے۔یہ ہے الدین اور یہ ہے الاسلام۔اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات وسعادت وابستہ۔یہ کہنا درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں۔لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن ہے کہ ''اصل دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے''۔

(ترجمان القرآن، جلد:1،ص:137)

''موجود تھیں'' اور ''موجود ہے''۔میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے حق وباطل ہونے کا انحصار ہے۔اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔سارا قرآن ایمان ہی کی تفسیر ہے جس کے اس نے پانچ اجزاء بتائے ہیں:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ
(2:177)

بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ' آخرت کے دن' ملائکہ' کتب' اور انبیاء پر ایمان لائے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار کفر اور صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝١٣٦ (4:136)

اور اللہ' اس کے ملائکہ۔اس کی کتب و رسل اور یومِ آخر سے انکار کرے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر تو ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور دیگر مقامات پر اس تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے اور سیاق و سباق اور نفسِ موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے۔مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:29)

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ہی کا ذکر ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
(2:62)

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عمل صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (4:178) (پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔) کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ (64:8)۔ (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا)۔

غرضیکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آتا ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شق اول ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب شق دوم کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ۔ رسل' کتب پر ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کی اتباع کی جائے (اطیعو اللہ) محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا' تصور میں اختلاف ہوگا۔ تعینِ صفات میں اختلاف ہوگا لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے؟ تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کا ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت۔ یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم۔ چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے ہیں اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ' اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی

مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے۔ خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی وہ کتابیں ضائع ہوگئیں۔ محرف ہوگئیں یا ساقط العمل قرار پاگئیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت بھی ختم ہوگئی۔ اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ان سب کے بعد نبی آخر الزماں تشریف لائے۔ جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے۔ اس لئے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآنِ کریم کی اتباع میں مضمر ہے۔ اب نبی اکرمؐ سے پیشتر رسولوں اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے۔ اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آچکے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (5:48)

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاویٰ کو) سچا کر کے دکھانے والی اور ان (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لئے ایک نئی کتاب آجانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ضابطۂ قوانین کا ہر نیا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے۔ بنابریں قرآن کریم کے بعد

مختلف اہل مذاہب (یا اہل کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہوکر زندگی بسر کرنا اصولاً غلط ہے۔ اب ''سچائیاں'' (ان کے ہاں کی اور ان کے علاوہ تمام جن کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہے) صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب کے آنے پر' اسی رسول اور اسی کتاب کی اتباع ضروری ہو جاتی تھی۔ اس لئے ہر رسول سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اپنی امت سے کہہ دیں کہ جب رشد و ہدایت آسمانی کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آ جائے' جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آئے گی تو تم سب کو اس آخری کڑی کی اتباع کرنی ہوگی۔ سورۂ اعراف کے انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ دعا مانگتے ہیں کہ بارالہا! تو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوا کہ بے شک ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ صرف ان کے حصہ میں آ سکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے۔ یعنی ان کی اتباع کریں گے۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ (7:156-157)

وہ رحمت میں ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو خدا کی حفاظت میں رہیں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو اس نبی امی کا اتباع کریں گے جسے وہ توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دے گا۔ بری باتوں سے منع کرے گا۔ پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا' ناپاک چیزیں حرام کرے گا اور وہ طوق و سلاسل جو ان پر پڑے ہوئے ہوں گے ان کو ان سے الگ کرے گا۔ جو لوگ اس

نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس کی مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

غور کیجئے کہ فلاح وسعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور قرآن کریم کی اتباع۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیاء کرامؑ کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ (3:81-85)

جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا۔ اور اس کی تائید کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا کہ بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا اور دیکھو! تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں۔ تو اب جو کوئی اس عہد و قرار کے بعد اس سے روگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور بالآخر سب اسی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول تم کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ کتبِ سماوی کے جو بچے کچھے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں ان میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاءؑ رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبی آخرالزماں) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے کہ یہی اس نظام خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد حضورؐ پر ایمان کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسروں میں فرق کرنے) کو پکا کفر قرار دیتا ہے۔(4:150)۔

شق دوم سے ظاہر ہے کہ:

(1) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انہیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔

(2) تفریق بین الرسل کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغامِ رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔

(3) نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنیٰ ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے۔ اور چونکہ حضور ﷺ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اس لئے قرآن کی اطاعت قیامت تک کے لئے ہے اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔

(4) اب جو کوئی خدا، اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے گا جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ (2:137)

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ محمدؐ رسول اللہ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لئے یہ تفریق بین الرسل نہیں۔ یعنی وہ حضور ﷺ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضور ﷺ کے درجۂ رسالت و عبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے صفحہ 119، یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(1) دوسرے انبیاء کرام کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان تو ضروری ہے لیکن

(2) نجات و سعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف اس کتاب کی کرتے ہیں جو محمدؐ رسول اللہ کو ملی تھی۔ اسی طرح اگر عیسائی اور موسائی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو منجانب اللہ سمجھ لیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کی کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شق دوم میں قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرم ﷺ (یا کتب سابقہ اور قرآن کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہوگا۔ یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور ان کی اطاعت بھی کی جائے جس طرح

ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیشرو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا۔ لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعے دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی۔ لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات علیھم السلام اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے۔ لیکن نبی آخرالزماں ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی۔ اس لئے کہ اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کردی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا تفریق بین الرسل سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار کرلیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی اکرمؐ) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کی جائے۔ اگر نبی اکرمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں ہے۔ کفر ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ (4:170)

اے نوع انسانی! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آ گیا ہے۔ سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لئے ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے۔ وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے لیکن اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے تو سوچئے کہ اس کے اس زبانی اقرار و ایمان سے مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضور ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا۔ اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت وسعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہوسکتی ہے لیکن وہ اتباع واطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا

ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا۔ اگر مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا۔

جو لوگ اس قسم کی ''رواداری'' اور ''وسعت نظر'' کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی میں اور جو مسلمان انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ از روئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسولؐ اللہ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی بھی کی جاسکتی ہے۔ تو وہ ان کے اس فریب پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمو سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں:

(1) خدائے واحد کی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے۔ بت پرستی کی مخالفت کی جائے۔

(2) صحیفۂ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(3) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(4) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

(5) ظواہر ورسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلجنس اینڈ ایتھکس)

''رواداری'' اور ''وسعتِ نظر'' کے تمام گوشے اس تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس کے باوجود برہمو سماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ مجھے ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی ''حقانیت اور صداقت'' کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کرلیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتناء نہیں۔ لیکن جو شخص قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہمنوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ

میں کہہ رہا ہے کہ:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِىِّ ٱلْأُمِّىِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾ (7:158)

(اے رسول! ان سے کہہ دو کہ) اے نوعِ انسانی۔ میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔ پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر۔ جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسول اکرم ﷺ کو خدا کا سچا رسول اور قرآن کریم کو خدا کی سچی کتاب ماننے کے دعوے میں سچا نہیں ہے تاوقتیکہ وہ قرآن کی اتباع نہ کرے اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب شق سوم کی طرف آیئے یعنی کیا اتباع میں احکام کتاب کی اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر ''خدا پرستی اور نیک عملی'' ہی نجات وسعادت کے لئے کافی ہے۔ اس باب میں جناب آزادؔ کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع ومنہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام واعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ پس شرع ومنہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع ومنہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر ورسوم کو انسانی نجات وسعادت میں کوئی دخل نہیں...... (ترجمان القرآن، جلد: 1، صفحہ: 163)۔

ان اقتباسات کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 172 کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابل ملاحظہ ہے:

(5) دین حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت ونجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔(ص:229 تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)۔

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خدا پرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور یہی اصل دین ہے۔اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور وطریقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے' اسی طرح نجات وسعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان' قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رو سے شرع ومنہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جنابِ آزادؔ نے اپنے اس نظریہ کی رو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضربِ کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجر مقدس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے نبی اکرم ﷺ سے پہلے جتنے انبیاء کرامؑ تشریف لائے وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا۔یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان ومکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا۔اس لئے ان کی وساطت سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیش نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے۔ نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے یہ نظام بالکل بدل گیا۔حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم' ملک' قبیلہ' گروہ یا کسی خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ آپ کا پیغام عالمگیر اور آپ کی مخاطب تمام نوع انسانی ہے۔سارا قرآن اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے۔حضور ﷺ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر ملک میں' ہر زمانہ میں' قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے حضور ﷺ کی رسالت یکساں ہے اس لئے جو تشریعی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے خاص حالات کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے

بلکہ وہ عالمگیر ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کریم کے تشریعی احکام' نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے تو اسلام کی ''عالمگیریت'' کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی لازم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ

ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام واعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔

اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے' اسلام نوع انسانی کا دین ہے اور اس کے احکام واعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھ کر اختیار نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر ورسوم کو میکانکی طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباعِ احکام نہیں۔ یہ ظواہر ورسوم جسم کی مثل ہیں جس میں روح کا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام حضورؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالاتِ زندگی کے پیش نظر اختیار کئے گئے تھے اور آج انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور نجات وسعادت میں انہیں کوئی دخل نہیں۔ کوئی جاہل ہوتا تو اسے ہم سمجھاتے بھی۔ حیران ہیں کہ جناب آزادؔ جیسے سمجھدار انسان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے۔ اور نظام کا ہر جزو کُل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکامِ قرآنی اس نظامِ اسلامی کے لاینفک اجزاء ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کر سکے یا اسلام کے دعوے کیساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ ''نجات وسعادت'' ان اعمال واحکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ''نجات و سعادت'' اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں' تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ ''خدا پرستی اور نیک عملی'' کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآن کریم کھولئے اور دیکھئے کہ اس میں ان احکام کی ''پابندیوں'' کو کتنی اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ

پہلے لکھا جا چکا ہے' اہل کتاب خدا کو بھی مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو (خاص حالات کے ماتحت) جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا اسی طرح ان اہل کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے وقت اہل کتاب کے خلاف جو فرد جرم (چارج شیٹ) عائد کی گئی ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے:۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ (9:29)

اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر' اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں' ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کرلیں۔

اس آیۂ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہوگئی:۔

(1) اہل کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآن کریم انکے اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ شقِ اول میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کی رو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

(2) اہلِ کتاب کا اس طرح پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام و حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآن کریم نے عائد کی ہیں۔ اس سے واضح ہوگیا کہ اسلام صرف ''خدا پرستی اور نیک عملی'' (بزعمِ خویش) کا نام نہیں بلکہ قرآن کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(3) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرمادی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اسلام میں داخل ہونا لازمی شرط ہے۔ دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لئے استعمال ہوئے ہیں ملاحظہ ہو (9:33، 8:28، 61:9)۔

مندرجہ صدر آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزادؔ کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:

اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر، نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرادیا ہے اور نہ ہی سچے دین پر عمل پیرا ہی۔۔۔

(ترجمان القرآن،ص:82)

ذرا غور فرمائیے۔ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافہ نے بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ”یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے۔“ یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انہیں حرام نہیں سمجھتے لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر کہ ”جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرادیا ہے۔“ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ ان چیزوں کو حرام سمجھیں جو ”ان کی کتاب میں“ حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔اندازہ فرمائیے قرآن کریم پر یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت! یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کس قدر بے باک ہے!

☆☆☆☆☆☆☆

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(1) قرآن کریم کی رو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں۔قرآن میں کسی جگہ خواہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا۔مقصود اس سے پانچوں اجزاء ہیں۔ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(2) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزو لاینفک ہے۔

(3) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کرلینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(4) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرم ﷺ کے بعد اطاعت، خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(5) قرآن کے تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اوران کی اطاعت لازمی ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریہ (یکسانیتِ مذہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (2:62)

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود اور نصاریٰ اور صابئین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور عمل اچھے کرے ان کا اجر ان کے اللہ کے پاس ہے اور ان کو کسی قسم کا خوف وحزن نہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور صابئین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ جو کچھ ہم اس وقت تک لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت صرف انہی دو اجزاء پر ایمان مقصود نہیں بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (2:137) (اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔)

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود ونصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں! اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہوگا!

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو نسلوں (قوموں) کے

اندر مقید کر رکھا تھا۔ توریت' قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لئے۔ مذہبِ عیسوی بھی انہی کے لئے' کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ ''میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔ بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جاسکتی۔'' ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی ورنوں کی رو سے ہوتی ہے اور ورنوں کی یہ کیفیت کہ نچلے ورن کا ہندو' نہ اوپر کے ورن میں جاسکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حرمِ قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودیوں کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابناء اللہ (خدا کی اولاد) میں داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ ایک پیدائش کی رو سے برہمن ہے۔ یعنی مذاہب عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ:

(1) نجات وسعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے اور

(2) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رو سے ہوتا ہے) اس لئے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں (واضح رہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصور ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے)۔

قرآن نے آ کر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی، نصرانی، صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے اور اعمال صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ (2:62)

باقی رہے مسلمان' سو انہیں بھی اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہئے کہ وہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں' نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انہیں بھی اپنے آپ کو صاحبِ ایمان ثابت کر کے اعمال صالحہ کے ذریعہ جنت کا مستحق بنانا ہوگا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ (4:136)

اے مسلمانوں (ایمان والو) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان محض زبان تک محدود تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا اور نہ اعمال حیات اس کے مصدق (انہیں منافقین کہا گیا ہے) زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی۔ لیکن میدانِ جہاد ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ ادھر ادھر کی بہانہ تراشیوں سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اصطلاحی ''مسلمان'' تھے۔ ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابل میں وہ پکے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ (9:44-45)

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے۔ (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیۂ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔

(1) ظاہر ہے کہ وہ اہل ایمان (سچے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے' اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ' کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(2) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے' مسلمان

کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے تھے لیکن قرآن ان کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ''اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔''

(3) لہٰذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ ''اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو'' تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا ''پیدائشی'' مسلمانوں ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہئے اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہئے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ (49:15)

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں) انہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کریں۔ یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان)۔

ان تصریحات کی روشنی میں اب ذرا فریقِ مقابل کے نظریہ کا تجزیہ کیجئے یعنی ایک مسلمان کے لئے ''نجات وسعادت'' حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیبِ خاطر منظور کرتا جائے۔ حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے۔ اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے تب جا کر کہیں ''نجات وسعادت'' کا متوقع ہو۔ اسکے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق ''خدا کی بھگتی'' کر لے اور کبھی کبھار کچھ ''دان'' (خیرات) کر دے۔ مثلاً چڑیوں کو دانہ ڈال دیا۔ سانڈ کے لئے چارہ خرید دیا۔ کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پر آٹا ڈال دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو کہیں پیاؤ بنوا دیا۔ اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا۔ سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ ''دان'' (خیرات) کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں۔ اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت نہ اسلامی احکام

کی کٹھن منازل طے کرنے کی حاجت۔ نہ ہجرت کی صعوبات اٹھانا ضروری، نہ خدا کی راہ میں سر کٹوا دینے کا سوال درپیش۔ (وہاں تو بلکہ جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ ہمسا میں داخل ہے) یہی نہیں۔ بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کرلے اور جس نظام کے ماتحت چاہے زندگی بسر کرے۔ وہاں نظام، انسانی اور خدائی نظام، یا عدمِ نظام کا سوال ہی کچھ نہیں۔ اسے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا۔ اب سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام کدو کاوش کا منتہیٰ ٹھہرا حصولِ نجات اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہو اور دوسری طرف اتنی آسانی سے۔ تو وہ کونسا ''صحیح العقل'' انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریق زندگی اختیار کرے گا جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو۔ تمہارے لئے نجات یقینی ہے۔ اگر ''رواداری اور وسعت نظر'' کی ایسی ''صلح کل'' روش اختیار کرلی جاتی تو نہ کہیں سے مخالفت کی آواز اٹھتی نہ کوئی برسرِ پیکار ہوتا۔ نہ حضورؐ اور آپ کے متبعینؓ کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا، نہ مکہ چھوڑنا پڑتا، نہ مدنی زندگی میں اس قدر غزوات اور سرایا کی ضرورت پڑتی۔ ساری دنیا خوش ہو جاتی اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان سامل جاتا اور پھر اس کے بعد آج تک یہ جو چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) ''مومن'' ہوتی، اور کفر و اسلام، حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

''خدا پرستی اور نیک عملی'' کے مبہم الفاظ پر ذرا غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا (پرستش) کرلے اور

جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار اور جسے برا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کر لے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جن کے لئے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ انہی الفاظ میں ''پرستش'' کا لفظ بھی داخل ہے۔ دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش اور پوجا (Worship) کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس کے لئے عبودیت کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یکسانیتِ مذاہب تک منجر ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے۔ جب انسانیت اپنے عہد طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی۔ جنگلوں اور غاروں میں رہائش، پھل اور شکار ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں۔ اس زندگی میں ''خدا'' کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے۔ خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کودنے سے جشن شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا، دیوی، دیوتاؤں کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھے۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحی آسمانی کی روشنی آ گئی اس نے انسانی تصورات کے ان غلط عقیدوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی، رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جل کر رہنے کی طرح ڈالی۔ اب انفرادیت سے قبائلی زندگی کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا، ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ احکاماتِ الٰہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رو سے

انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع' حاکم اور محکوم کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہ رہتی تھی اس لئے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی۔ خدا کے متعلق حاکم اور فرمانروا کا تصور بھی گم ہو جاتا اور پھر وہی ''پرستش'' کا ابتدائی تصور غالب آ جاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کی تمام جدوجہد کا منتہیٰ اجتماعیت کی تشکیل پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دے دیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کی مکمل ترین صورتوں کے لئے آئین وقوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جس قدر آئین وضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوو ارتقاء کے راستہ میں حائل ہوں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطہ حیات کی رو سے ہوسکتی ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعتوں کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو اور اس طرح انسان' اللہ کے سوا کسی اور کا عبد نہ بنے۔ یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق یعنی عبد و معبود' محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو نظامِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے قرآنی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مفہوم جو انسانیت کے عہد طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اس معنی میں ''خدا پرستی'' تو ہر مذہب میں ایک جیسی ہوسکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لئے جس ضابطۂ خداوندی کی رو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جا سکتی ہے وہ آج قرآن کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کا ہے۔ ''خدا پرستی'' (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش کرنے) کا نہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ ''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت کو جائز نہیں سمجھتا۔'' باقی

چاروں اجزائے ایمان اسی اصل کی شاخیں ہیں۔یعنی

(1) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار۔	
(2) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رو سے اختیار کی جائے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، اور جس کی آخری شکل قرآن کریم ہے۔	کتابوں پر ایمان
(3و4) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل ہوتے رہے، اس سلسلہ کی آخری کڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔	ملائکہ اور رسولوں پر ایمان
(5) اس طرز زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔	آخرت پر ایمان

یہ ہے قرآنی ایمان سے مفہوم۔ان اجزائے ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا۔مقصد پورے کے پورے نظام سے ہے۔

اب رہی ''نیک عملی'' سو روحِ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں رہتی۔ ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اٹھے نیک ہے اور جو اس کے خلاف ہو برا ہے۔انسان اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باللہ سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا اسی طرح اس کا نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا۔اس زمانے میں زندگی انفرادی تھی اس لئے نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا۔مثلاً اگر وہ دیکھتا کہ ان میں کا ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے، ضعیفوں کی مدد کرتا ہے۔جانوروں پر شفقت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتا اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہوسکتی ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے۔اس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب وتمدن کے اساس ومبانی کیا ہیں۔وہ انسانوں کے لئے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتی ہے۔دنیا پر اس تہذیب ونظام کے اثرات کیا ہیں۔اگر اس کے اثرات انسانیت کش ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی ''نیکیاں'' (مثل خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پاسکتیں۔جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو رہیں گے، ان کا کوئی عمل، عمل صالح نہیں کہلا سکے گا کسی کی رگِ جان پر

جونکیں لگا دینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں شربت ٹپکانا' سطح بین نگاہوں میں ہی نیکی قرار پا سکتا ہے۔ قرآن کریم نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے جس کا مفہوم تمام نوع انسانی کے مفاد کا تحفظ ہے۔ اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے۔ ایک شخص بڑا مخیر ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ غریبوں کی امداد کرتا ہے عادات وخصائل نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن حکومت وقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے تو حکومت کی نگاہوں میں یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ اس کی ''ذاتی نیکیاں'' اس کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف زندگی کا نام کفر۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزان خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (9:17) (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائگاں جاتے ہیں) یعنی جن اعمال کو وہ بزعمِ خویش نیک سمجھتے ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں' اس لئے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا۔ آپ چاک کو کونین سمجھ کر صبح وشام پھانکتے رہئے' ملیریا کبھی دور نہیں ہوگا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٣٩﴾ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ ﴿٤٠﴾ (24:39-40)

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی) چیز اسے نظر نہیں آتی۔ (البتہ) وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے

کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے۔ یا (ان کے اعمال) ایک بحرِ ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور ان کے اوپر (سیاہ) بادل تو بر تو ظلمات (ایسا کہ جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو سجھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

اس لئے کہ یہ لوگ نظام حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں۔ نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے کیسے دل نشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾ (9:19)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوا دینا) یا خانۂ کعبہ کی خدمت (کرنے والا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستے میں جدوجہد کرتا ہے (تمہاری سطح بیں نگاہیں کچھ ہی کہیں) اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ قرآنی معیار کے مطابق ''نیک عملی'' کسے کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمایئے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لئے کسی خاص نظامِ زندگی کی ضرورت نہیں ''خدا پرستی اور نیک عملی'' جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے' نجات کے لئے کافی ہے' کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا' وہ تو امن

وسلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعوے کا اعلان و تبلیغ نوعِ انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض ادھر ادھر کے بے قاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اسی کی طرف سے ہوگی جو یہ کہے گا کہ نہیں سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھواؤ اور دوائی خرید لو۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانہ سے مل سکیں گے (باقی دواخانے ہمارے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دھوکا دیتے ہیں) تو ہر دواخانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ وفیھا ایات لقوم یعقلون۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس مقالہ میں اسلام کے لئے بھی ''مذہب'' کا لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' اسلام درحقیقت مذہب نہیں' دین ہے۔ اس لئے اسلام کا مذاہب عالم کے ساتھ مقابلہ ہی غلط ہے۔ جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ اس کا مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی ہیں نظام حیات۔ اس لئے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر نظامہائے حیات کے ساتھ کرنا چاہئے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کی اتباع میں اور لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں۔ جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے۔ جب مقصد پوجا پاٹ ٹھہرا تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا اور مسجد میں کر لی تو کیا۔ جب مقصود یاترا ہو جائے تو ہردوار چلے گئے تو کیا اور مکے ہو آئے تو کیا۔ جب مطلب دان (خیرات) سے ہو تو کسی کو بھیک دے دی تو کیا اور زکوٰۃ دے دی تو کیا۔ اس تصور کے ماتحت فی الواقعہ ''خدا پرستی اور نیک عملی'' سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے بلکہ اس کے لئے ''خدا پرستی'' کی شرط بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ضوابطِ اخلاق (سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی

ان ضوابط کو اچھا کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ''خدا پرستی'' بھی کچھ ضروری نہیں رہتی۔ ان ضوابط اخلاق کا نام ''سچا دین'' قرار پا جاتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے اس لئے ان کے ہاں بھی خدا سے صرف پوجا پاٹ کا تعلق باقی رکھا جاتا ہے اور ''نیک عملی'' ان ضوابط اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے۔ چند عقائد' چند عبادات کی شکلیں اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں۔ بس ان کے مجموعے کا نام ہے اسلام۔ اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں۔ ابوالکلام صاحب کے پیش نظر بھی اسلام کا یہی تصور تھا اس لئے ان کا نتیجہ' مستخرجہ بھی ٹھیک تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور باقی مولویوں میں فرق صرف اتنا ہوا کہ انہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی۔ ورنہ عملاً ہر مولوی کا یہی عقیدہ ہے خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ یا یوں کہئے کہ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے۔

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں' ایک نظامِ حیات ہے تو پھر اس بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر نظامِ حیات ایک خاص ذہنیت کا مقتضی ہوتا ہے جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو' اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان اس خاص ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن کی رو سے تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی نظامِ حیات ہے۔ لہٰذا تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی اندازِ ایمان ہے۔ اسلام کے اس قرآنی تصور کی رو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نظام ہر قوم اور مذہب میں ایک جیسا ہے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں اور ہے ہی نہیں۔ اس لئے تقابل کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔